کی وفات کا سنہ ۶۹۸ھ لکھا ہے۔ اور یہی زیادہ صحیح اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یاقوت نے شہر بغداد میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور احمد بن حنبلؒ کی قبر کے پاس مدفون ہوئے۔

کسی نے ان کی تاریخ وفات یوں کہی ہے ؎

یاقوت جمال دین شہِ اہلِ ہنر
در صبح خمیس سادسِ شہرِ صفر
در سبعہ وستین بُدُ دست مِائہ
کز دارِ فنا باآخرت کرد سفر

کسی اور نے یاقوت کے بارے میں کہا ہے ؎

بہ گرد گلِ خط از عنبر نوشتی
بساط حسن خوبان در نوشتی
کسی بالاتر از یاقوت ننوشت
تو از یاقوت بالاتر نوشتی

اب ہم اس مقالے کو یاقوت ہی کے الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں :-

"اعلم ان الخط مخفی فی تعلیم الاستاذ و قوامہ بکثرۃ المشق وترکیب المرکبات وترک المنهیات وصفاءہ بصفاء الباطن وحسنہ بحسن النیۃ "

پروفیسر گارڈنر براؤن

(دوسری قسط)

محمد تغلق کا طرزِ حکومت

لیکن محض برنی کی فروگزاشتوں اور تعصبات کا ذکر کرنا کافی نہیں، سلطان کے عہدِ حکومت اور سیرت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ ان مسائل خمسہ پر ایک نظر نہ کی جائے جن کی بنا پر اس کا عہد حکومت سب سے زیادہ بدنام ہے۔ گو اس مضمون میں سب پر تفصیل کے ساتھ نظر کرنا ناممکن ہے۔

ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے سب سے پہلے دوآب میں ٹیکس کا مسئلہ ہے اور اس کے متعلق دو لفظ کافی ہیں۔ دوآب ملک کا سب سے زیادہ مرفہ الحال علاقہ تھا اور جیسا کہ علاؤالدین کے زمانے میں ثابت ہوچکا تھا، بآسانی موجودہ ٹیکس سے زیادہ برداشت کرسکتا تھا، جدید ٹیکس ہرگز زائد نہ تھا۔ بلکہ بعد کو جو ٹیکس لگایا گیا اس کے مقابلے میں ہلکا ہی تھا، البتہ سوءِ اتفاق سے اس کے بعد ہی اس عہد حکومت کا پہلا قحط پڑگیا۔ اس سے مخالفین کو موقعہ ہاتھ آگیا، کہ جو شئے امساکِ باران کا نتیجہ تھی، اسے جدید ٹیکس کی جانب منسوب کردیں۔

بادشاہ کی دوسری غلطی جو بقول برنی سلطنت کی تباہی و بربادی کا باعث ہوئی، یہ تھی کہ کہ دیوگیر کو دارالحکومت بنایا گیا اور دہلی کی خلقت کو وہاں منتقل کیا گیا، بادشاہ کی اس کاروائی

کو سمجھنے کے لیے اس زمانہ کے جغرافیہ سیاسی کی تفصیلات کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ تغلق خاندان کے دَوِ ابتدائی فرماں رواؤں کی سلطنت تین متفرق حصوں پر مشتمل تھی، ایک حصے میں وادیٔ گنگا، پنجاب کے میدان جن کی مغربی حد لاہور تھی اور وادیٔ سندھ کی ایک چٹ جس کے جنوب میں ملتان تھا، شامل تھے۔ دُوسرا حصہ جو اس سے نسبتہً چھوٹا مگر کافی وسیع رقبہ اور گنجان آبادی کا تھا، اس میں خاندیش کا مشرقی علاقہ، برار، حیدرآباد اور احاطۂ مدراس کے ساحل مشرقی کی چٹیں شامل تھیں۔ تیسرا حصہ شمالی گجرات کے اس علاقے کا نام تھا جس کا منتہی خلیج کھمبات ہے۔ یہ گو پہلے دونوں حصوں سے بہت چھوٹا تھا، تاہم اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ اس کے بندرگاہ بیرونی تجارت کے مرکز تھے۔ ان متفرق حصوں کے درمیانی رابطہ کا کام دینے والی وہ پتلی سی چٹ تھی جو گرالیار سے وہار تک اور پھر وہاں سے مغرب و جنوب تک پھیلی ہوئی تھی، مگر یہ چٹ گویا عبارت ان چند قلعوں سے تھی جو مضافات اجین کے ایک قطعہ کو چھوڑ کر باقی تمام سڑک کی حفاظت کے لیے جابجا قائم تھے۔ سلطان کے عہد کے آغاز ہی میں دو وجوہ سے جنھیں برنی پی جاتا ہے سلطنت کا مرکز ثقل ہٹ چکا تھا۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ مغلوں کی صد سالہ یلغار نیز ایک زبردست سیلاب سے جس نے دریاؤں کے رُخ پھیر دیئے تھے اور ہزارہا افراد کو بے خانماں کر دیا، پنجاب کی اہمیت اب بہت گھٹ گئی تھی۔ دُوسری وجہ یہ تھی کہ جنوب کا جدید علاقہ موسومہ دکن، مگر جس میں دکن کے علاوہ بھی بہت کچھ شامل تھا حال میں حاصل ہوا تھا۔ اس جدید علاقے کی نوعیت شمالی ہند سے بالکل جداگانہ تھی، پھر ہنوز پوری طرح تسلط بھی نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی جنوبی سرحد پر مخالف یا نیم مخالف حکومتیں موجود تھیں، اس لیے اس کا نظم و نسق ایک دشوار مسئلہ تھا، اور اس عہدِ حکومت میں اس کے حل کرنے کی تین مختلف کوششیں کی گئیں۔ جن میں سے پہلی اور مانحنُ فیہ سے تعلق رکھنے والی یہ تھی کہ جدید صوبجات کو سلطان کی نگرانی میں رکھا جائے اور دیوگیر کو جو دہلی کے مقابلے میں مرکز سلطنت سے قریب تر اور موقع خطرات کے متصل تھا دوسرا پایۂ تخت قرار دیا جائے۔ اس تجویز کی پوری تفصیلات آج موجود نہیں، تاہم جو کچھ موجود ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ سلطان کے زمانۂ قیام دکن میں وزیر کو بحیثیت نائب السلطنت کے

شمال میں پورے شاہانہ اختیارات حاصل ہوتے۔ اور اگرچہ دونوں پایۂ تخت ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھے تاہم عموماً اس حالت بھی سرکاری ڈاک اور قاصدوں کی خوش انتظامی کی بناء پر دونوں مقامات کے مابین نامہ و پیام کچھ دشوار امر نہ تھا۔ بعد کو ایسے حالات پیش آئے جن کی تفصیل یہاں غیرضروری ہے۔ جن کی بناء پر یہ قصد قوت سے فعل میں نہ آسکا، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداءً ایک امر صعب کا یہ ایک معقول حل تھا۔

اس اسکیم کی تہ میں جو اصل اسباب تھے، انھیں چھوڑ کر مؤرخین اپنی ساری توجہ اس پر صرف کرنے لگے ہیں کہ اس تجویز پر عملدر آمد کن طریقوں سے کیا گیا اور اس بحث میں اُلجھ کر وہ اسے بھی نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اس تجویز پر دو مختلف دور گزرے ہیں :-

پہلا دور یہ تھا کہ تقریباً ۱۳۲۷ء میں دفاتر سرکاری اور ضروری عملہ دیوگیر منتقل کیے گئے۔

دُوسرا دور جو کئی سال بعد شروع ہوا یہ تھا کہ آبادی کے دوسرے طبقات کو وہاں منتقل کرایا گیا۔ اور سلطان کی بدنامی کی یہی سب سے بڑی بنیاد ہے۔

لیکن سلطان نے دہلی میں جو عظیم الشان تعمیرات کرائیں اور ابن بطوطہ نے شہر کی مرفہ الحالی کی جو کیفیت بیان کی ہے اس کے بعد برنی کی اس روایت پر کون یقین کر سکتا ہے کہ شہر میں ایک کتا، ایک بلی تک باقی نہ رہ گئی۔ اور دوسرے شہروں سے جو لوگ لاکر یہاں آباد کیے گئے، ان میں سے کچھ تو مر گئے اور باقی اپنے اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔ یہ الفاظ ایک متعصب گواہ کے ہیں جنھیں مشرقی مبالغہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اغلب یہ ہے کہ دہلی میں یہ نئی آبادی پنجاب کے سیلاب، ترماشیریں کے متواتر حملوں اور پہلے قحط کی بناء پر پیدا ہوگئی ہو لیکن اس ضمنی قیاس سے قطع نظر کرکے اصل مسئلہ پر توجہ کیا جائے [illegible]

[illegible] تھی کہ ایک [illegible] ملک میں جدید پایہ تخت کو آباد کیا جائے تو [illegible] کے لیے اس مقام سے بہتر کہاں کے انتخاب کا انتخاب ہو سکتا تھا جس کی آبادی نہایت [illegible] اور برابر بڑھتی جاتی تھی۔ پایۂ تخت کی تبدیلی کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا، اکبر

فتحپور سکری، چتوڑ، مانڈو یہ تمام نظیریں موجود ہیں اور اس سے بھی بہتر نظیریں ایران سے مل سکتی ہیں۔ چنانچہ ڈیوگیر کے واقعہ سے دس سال ہی پیشتر شاہ فارس الجیتو خان نے ایک جدید شہر سلطانیہ آباد کیا تھا اور تبریز کے کاریگروں کو وہاں منتقل کیا تھا۔

رہا یہ کہ اس انتقال مکانی کے لیے تدابیر کیا اختیار کی گئیں، سو اس کے متعلق تفصیلات بعد کو گھڑ لیے گئے اور افواہ کی حیثیت سے مشہور ہوتے رہے۔ لیکن مستند روایات ان کی تائید نہیں کرتے۔

تارکانِ وطن کو جو چیزیں چھوڑنا پڑتی تھیں، ان کے لیے انھیں فیاضانہ معاوضہ ملتا تھا زادِ راہ و مصارف سفر کے لیے انھیں معقول رقمیں ملتی تھیں اور نو تعمیر و خوش قطع شہر میں وارد ہونے پر انعامات و معافیاں دی جاتی تھیں۔

یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ راستے میں وفات پا گئے، کچھ لوگوں نے پھر دہلی کو مراجعت چاہی اور اکثروں کو صعوباتِ سفر اور ایک اجنبی و نامانوس شہر کا قیام ناگوار تھا، لیکن ان لوگوں کے ساتھ اس قدر مراعات کے باوجود ہندوستان میں یہ کبھی بھی دستور نہیں رہا ہے کہ ضروریات سلطنت کے مقابلے میں افراد رعایا کی خواہشوں کو لازماً پامال کیا جائے۔ اس لیے جب برنی حمایتِ جمہور میں غربا کے مصائب کا مبالغہ آمیز بیان کرتا ہے تو ناظرین کی ہمدردی خواہ مخواہ اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

اس کے عہد کے واقعات میں ایک نہایت مشتبہ اور اس لیے دلچسپ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے چاندی کے بجائے پیتل کے فرضی سکہ کا رواج دیا تھا، اس کو مشتبہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستانی مؤرخین اس کے سمجھنے سے عاجز رہے ہیں بلکہ اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ دو معاصر مصنفین، ابن بطوطہ و صاحب مسالک الابصار، جو اپنے عہد پر خاص نظر رکھتے ہیں ان امور کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتے۔ برنی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ پیتل کا سکہ سرکاری سکہ کی حیثیت سے چلایا گیا، اس پر ہر ہندو نے جعلی سکہ بنا بنا کر محاصل سرکاری میں دینا شروع کیا اور اس سے سرکار کو سخت خسارہ ہوا، ان کی قیمت برابر گھٹتی رہی، تا آنکہ منسوخی کا فرمان جاری ہوا اور خزانہ عامرہ پر شدید بار ڈال کے [illegible]

جعلی سب سکّے خود خرید کرلیے۔"

اس روایت کے جو جزئیات خلاف قرینہ وقیاس معلوم ہوتے ہیں، ان سے قطع نظر کرکے ان دو اصلی سوالوں پر غور کرنا چاہیے :-

(۱) یہ سکّے کیوں جاری کیے گئے تھے ؟ اور

(۲) اُن کے چلن میں ناکامی کیوں ہوئی ؟

پہلے سوال کے جواب میں مؤرخینِ ہند کے عجیب مہمل بیانات ہیں۔ برنی کہتا ہے کہ سُلطان کے مصارف نے خزانہ خالی کردیا تھا، حالانکہ پیشتر خود اس کے خلاف کہہ چکا ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ سلطان کو جو ملک گیری کی ہوس تھی اس کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی۔ بدایونی کا بیان ہے کہ انتقالِ پایۂ تخت سے خزانہ پر سخت بار پڑا تھا۔ حال کے مؤرخین انھیں اسباب کا اعادہ کرتے رہے ہیں، مع اس احمقانہ رائے کے کہ سلطان کا ایک مجنونانہ فعل تھا، یہ بے شبہ ممکن ہے کہ پہلے قحط کے ساتھ اسبابِ بالا نے مل کر محاصل سرکاری میں کمی اور اس لیے سرکاری خزانہ پر بار پیدا کیا ہو لیکن اتنی بڑی کاروائی کے لیے یہ معمولی اسباب کافی نہیں ہو سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ خود محمد تغلق، یا مشیران سلطنت میں سے کوئی شخص سکہ جات کے معاملات میں ایک عدیم المثال ماہرفن کی حیثیت رکھتا تھا جو اس فرضی سکہ کے اجراء سے پیشتر مسئلۂ زر میں چار اہم وعظیم الشان اصلاحات کرچکا تھا، اس لیے یہ قیاس میں نہیں آتا کہ اس نے اس کا اجراء ناواقفیت یا ہوس کی بناء پر کیا ہو۔ پھر تین ہی برس پیشتر ایران میں فرضی سکہ کے چلن کو نہایت سخت ناکامی ہوچکی تھی، اس لیے یہاں اس کا اجراء تاوقتیکہ کوئی شدید ضرورت اس کی مقتضی نہ ہوتی بالکل بعید ازقیاس تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سلطان کو اپنی اس اسکیم کی کامیابی کے لیے سخت کاوش تھی کیونکہ گو ان سکوں پر ایران وچین کے زر قرطاس کی طرح کلمات تخویف یا ترہیب نہیں درج تھے، تاہم محمد تغلق نے مذہب کا واسطہ دلا دلاکر اپنی رعایا سے اپیل کیا کہ اس سکہ کو چاندی کے مساوی خیال کیا جائے۔ ان آخری الفاظ سے اصل مسئلہ کا حل ہوا جاتا ہے۔ سالہاسال سے دُنیا میں چاندی کا ذخیرہ گھٹتا جاتا تھا اور اس کا احساس سلطنت دہلی کو اس وقت ناگزیر تھا، جب ایک وسیع علاقہ نیا نیا قبضہ میں آیا تھا اور وہاں کے لیے بہ کثرت

جدید سکّوں کی ضرورت تھی ۔ قرونِ وسطیٰ میں چاندی کی مقدار دنیا میں کل اتنی رہ گئی تھی کہ بعض معمولی ضروریاتِ زر کے لیے کافی تھی اور کہیں معمولِ عام کے خلاف چاندی کے مصرف میں کوئی تغیر یا اس کے ذخیرہ میں کچھ کمی ہو جاتی تو سکّوں کا قحط ہو جاتا تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت یہ دونوں اسباب واقع ہوئے تھے، یعنی ایک طرف تو ٹرنسیلوینیا، سیکسنی و اسپین میں ذخیرۂ نقرہ کی کمی واقع ہوگئی تھی - اور دوسری طرف اکثر مغربی اور مشرقی ممالک میں تیش و تزئین کی افراط سے چاندی کی بڑی مقدار، زیورات وغیرہ کی صنعت میں منتقل ہوگئی تھی۔ چنانچہ انگلستان، مصر، جاپان، فلانڈرز، ایران، و اسکاٹ لینڈ جیسے دور دراز ممالک کی تاریخ قانون و مالیات میں اس کے شواہد اسی وقت ملتے ہیں جب کہ سلطان چاندی کے قائم مقام کی تلاش میں مصروف تھا۔ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اس نے زرِ قرطاس کو کیوں نہ رواج دیا جو چین میں صدیوں سے چل رہا تھا اور جاپان میں اسی زمانہ میں شروع ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ ایسی نئی بات کے کرنے پر وہ آمادہ نہ ہوسکا ہو، یا آب و ہوا کے اثر سے کاغذ کے خراب ہو جانے کا اسے اندیشہ ہوا ہو یا اس کی طباعت کے لیے ٹاپ کے جو بلاک لازمی ہوتے ہیں وہ مہیا نہ ہوسکے ہوں۔

لیکن سب سے زیادہ قرینِ قیاس یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں یہ دستور ۱۲۹۴ء ہی میں ناکام ثابت ہو چکا تھا اور اس کی شہرت عام ہوگئی تھی۔ اس شق کے خارج ہو جانے کے بعد پیتل کا سکّہ ڈھالنے میں کوئی عیب نہیں رہ جاتا۔ اور چونکہ اس زمانے میں روپے کو وزن کرکے اور مس کرکے پرکھنے کا عام دستور تھا، اس لیے پیتل کا انتخاب سب سے بہتر ہوا۔

یہ اسکیم اگر اس دورِ جہالت میں ناکام رہی تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس میں کسی حد تک بھی کامیابی کیونکر ہوئی۔ پورے تین برس تک یہ سکّے چلتے رہے جب جاکر کہیں ناکامی کے علامات ظاہر ہوئے۔

برنی کی روایت کہ ہر ہندو کا گھر ٹکسال بن گیا، سخت مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ ایک تو یہ سکّے نہایت سبک و نازک ہوتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جعلی سکّہ بنانے

کے مجرموں کی سزاؤں کا کہیں ذکر نہیں۔ جعل کا رواج غالباً دکن کے علاقوں میں پڑا، جہاں بہمنی فرماں رواؤں کو آگے چل کر اس انکشاف نے سخت نقصان پہنچایا کہ ہر سُنار کو سکہ ڈھالنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن جعلی سکوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر یہ غضب ہوا کہ صوبجات بعیدہ کے مہاجنوں نے جتنے سونے اور چاندی کے سکے مل سکے سب کو خرید کر لینا شروع کیا اور اس سے بیرونی تجارت میں خواہ مخواہ خلل پڑ گیا۔ قیمتی دھاتوں کے ذخیرہ میں اس سے جو کمی پڑ گئی، کچھ اس نے اور کچھ اس امر نے کہ چاندی کے سکے زیادہ مقدار میں ڈھلنا موقوف ہوگئے تھے، قدرتی طور پر جدید فرضی سکوں کی قیمت بہت گرا دی۔ سلطان نے غایت دیانت اور معاملات مالی کے اصول شناسی سے حسب عادت فوراً زر فرضی کو منسوخ کرکے بیتل کے تمام سکے واپس خرید لیے۔ یہ کارروائی پُر مصارف ضرور ثابت ہوئی، لیکن اس سے تلبیس زر کا سدّباب ہوگیا اور ساکھ ایسی قائم ہوگئی کہ ابن بطوطہ جس نے دو ہی سال کے بعد اس ملک کی سیاحت کی، اس امر کی طرف اشارہ تک نہیں کرتا۔

اس سارے معاملے پر نظر کرنے کے بعد فیصلہ یہ کرنا پڑتا ہے کہ ایک اہم دشواری کا یہ ایک معقول حل تھا، یہ ناکام رہا۔ مگر کوئی دُوسری صورت بھی تو کامیابی کی نہیں ہوسکتی تھی۔

اس کے بعد تسخیر خراسان کا نمبر آتا ہے، جس پر برنی و متأخرین اس قدر مضحکہ کرتے ہیں کہ سلطان کا خیال واقعی ایسا مہمل اور نرالا تھا جیسا کہ ان مؤرخین کا بیان ہے۔ گزشتہ فاتحین اسلام محمود غزنوی و شہاب الدین غوری کے تحت میں شمالی ہند اور خراسان دونوں تھے، خود علاؤالدین کی جو دہلی کا آخری زبردست فرماں روا تھا، یہی تمنا تھی، شیر شاہ جو خاندان تغلق کے مقابلہ میں کہیں کم مقدرت رکھتا تھا، اُس کے حوصلے تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ درآں حالیکہ شیر شاہ کی دیوانگی و حماقت کا کوئی مدعی نہیں، پھر کیا چودھویں صدی میں یہ ارادہ ناممکن العمل تھا؟ ایران کی قوت ابوسعید کے تنزّل پذیر زمانے میں ٹوٹ چکی تھی، اس کا بڑا حامی امیر شاہان جو پچھلے حملہ آوروں کے مقابلے میں سپر کا کام دیتا رہا، دنیا سے رخصت ہوچکا تھا، اس کی شمالی و مغربی سرحدوں پر جو دو سلطنتیں تھیں وہ ایسی مخالف

تھیں کہ بجز مالِ غنیمت میں حصہ لگانے کے انگلی تک نہ اٹھاتیں، ان میں سے ایک یعنی خاندان چغتائی کا تاجدار ترماشیرین خود ایک سے زائد بار حملۂ خراسان کی تیاری کر چکا تھا اور اس وقت محمد تغلق کا حلیف تھا، دُوسرا سلطان مصر تھا جو مغربی سرحد پر دانت لگائے ہوئے تھا اُس کے خوف سے بہت سی ایرانی فوج وہیں رُکی ہوئی تھی۔ اور محمد تغلق نے اس کے پاس سفیر بھی بھیجا۔ یہ منصوبہ عملاً حملہ کی شکل میں آنے کے کہاں تک قریب پہنچ گیا تھا، اس کا اندازہ خود سلطان کے طرزِ عمل سے ہوسکتا ہے، اُس نے خراسان کے اُمراء اور سرداروں کو جو تحائف بھیجے اور رشوتیں دیں، ان کے معنی صرف یہ تھے کہ حملہ کا ارادہ عنقریب تھا، ورنہ اگر مستقبل بعید کے لیے یہ منصوبہ ہوتا تو اس وقت یہ تمام چیزیں قطعاً لاحاصل تھیں، اسی طرح فوج کی بھرتی بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ارادہ عین وقت پر ملتوی کیا گیا۔ گو یہ ممکن ہے کہ یہ فیصلہ کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی ہو۔

مگر یہ منصوبہ آخر ادھورا کیوں رہا؟

برنی اس کے اسباب کو یا تو قصداً پی جاتا ہے، اور یا چونکہ وہ ہندوستان کے باہر کے حالات سے قطعاً ناواقف ہے اس لیے بیان کر ہی نہیں سکتا۔ اور دُوسرے ہندوستانی مصنفین بھی اسی کی طرح خاموش ہیں۔ خوش قسمتی سے بعض دُوسرے ذرائع موجود ہیں اور ان سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کامیاب ہونے والی تجویز کے ادھورے رہ جانے کے غالباً یہ تین اسباب ہوئے :۔

(۱) اوّلاً سلطان مصر کا شرکت سے انکار، اور شاہ ابوسعید سے اس کے مراسم کی تجدید۔

(۲) ثانیاً چین کی غیر متوقع مداخلت جو ترماشیرین کو ایک سرکش ماتحت اور شورش انگیز ہمسایہ کی حیثیت سے دیکھتا تھا اور جسے اس کے اقتدار میں اضافہ قدرتاً ناگوار ہوا۔ یہ مداخلت اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ ابوسعید کے والد متوفی کو خطاب عطا کیا گیا۔ یہ عطائے خطاب چین کے طرزِ عمل کے لحاظ سے خاص طور پر اہم و معنیٰ خیز تھا۔

(۳) تیسرا اور سب سے قطعی سبب یہ ہوا کہ ترماشیرین کو جو چار سال سے سرحد خراسان

پر حملہ کی شرکت کے انتظار میں تھا، خود اسی کے سرکش امرا نے معزول کردیا۔ ان اتحادیوں کے ٹوٹ جانے کے بعد محمد تغلق کی یہ کمال عقلمندی تھی کہ تن تنہا اس مہم عظیم سے دست بردار ہوگیا۔

لیکن اگر یہ منصوبہ سلطان دہلی کے لبساط سے بڑھ کر تھا تو تسخیر چین کا خیال توقیناً مجنونانہ کہا جائے گا؟

بیشک یہ خیال مجنونانہ تھا اگر اس کے معنیٰ یہ تھے کہ ہمالیہ وتبت کا سفر اختیار کرکے پیکن کے دروازوں پر حصولِ فتح کی امید کی جاتی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ سلطان پر جتنے الزامات لگائے جاتے ہیں وہ ان میں سب سے زیادہ نامنصفانہ ہے۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد ضعیف ترین شہادت پر ہے، نیز تعلقات خارجہ کی ایسی ناواقفیت پر جس کا مجرم محمد تغلق ہرگز نہیں ہوسکتا۔ دراصل مہم کا رجل کا مقصود بالکل متعین تھا، یعنی ایک ہمسایہ پہاڑی کی ریاست کی تسخیر۔ جو شاید ایک مبہم طور پر اپنے تئیں چین کے زیر اقتدار کہتی تھی، اس مہم کا تعلق سال گزشتہ کی تسخیر کانگڑا سے تھا۔ اور ممکن ہے کہ اسی کا ایک جزو ہو۔ اس امر کے یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ جس ضلع پر فوج کشی ہوئی تھی وہ وہی ہے جو آج کالو کے نام سے موسوم ہے اور مدعا یہ تھا کہ دہلی کے اقتدار کو ہمالیہ کی قریب ترین ریاست تک وسیع کیا جائے۔

یہ مہم پوری طرح کامیاب رہی اور اس کا مقصود حاصل ہوگیا، گو برنی اس تصریح کو نظرانداز کرجاتا ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ ایک دوسرے مؤرخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، مصیبت کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ فوج کا ایک دستہ اپنے افسروں کے احکام کے برخلاف سرحد کے پار بڑھتا ہوا چلا گیا اور غالباً مان سرور جھیل کے مضافات میں گھر گیا، اتنے میں شدید بارش ہونے لگی اور اس کوہستانی بارش نے افواج سلطانی کو انتہائی مصائب میں مبتلا کردیا۔ تاریخ قدیم ان واقعات سے لبریز ہے کہ موجودہ یورپین نظام حرب سے پیشتر جب کبھی بھی اچانک بارش ہوئی، شمالی ہند کی افواج ہمیشہ ایک بلائے ناگہانی میں مبتلا ہوگئی ہیں اور حفظانِ صحت

کی بدانتظامیوں نے ہمیشہ وبائیں پیدا کر دی ہیں۔سپاہیوں کی طرح حریص افسروں نے بھی رخصت کی درخواستیں دے دے کر دہلی کو مراجعت شروع کی۔راستہ میں ان خستہ و خراب، ملول و علیل، منتشر و بے سروسامان مسافروں پر پہاڑی برگوں نے حملے شروع کر دیئے۔ان افسوس ناک حالات نے عموماً مؤرخین کے متخیلہ کو اتنا مؤثر کیا کہ وہ یہ ذکر کرنا بھول گئے کہ علاقے کا الحاق بہرصورت دہلی سے ہوگیا اور یہ تخلیہ محض عارضی تھا، تلون مزاج پبلک مقصود اصلی کی کامیابی کو نہیں دیکھتی اور محض نااہل افسروں کے سبب سے جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا الزام سلطان کے سر رکھتی ہے۔

اس عہد کی بغاوتوں پر بحث کرنا ضروری نہ تھا، اس لیے کہ جیسے سب کی حکومتوں میں بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں، ان کے عہد میں بھی ہوئیں۔فرق صرف اتنا رہا کہ سلطان نے باغیوں کے سرداروں کے ساتھ عموماً نرمی کا برتاؤ کیا۔لیکن برنی، حسب عادت یہاں بھی سلطان کے خلاف زہر اگلنے میں کمی نہیں کرتا۔

لیکن برنی کے تعصبات اور رنگ آمیزیوں کی تنقیح سے اگرچہ سلطان کے سیرت و طرز عمل کے متعلق صحیح رائے قائم ہوسکتی ہے۔تاہم اس سے یہ نہیں کھل سکتا کہ آخر سلطان کے طرزِ عمل کے خلاف اس قدر برہمی کیوں پیدا ہوئی؟

برنی کے تعصب و آزردگی کے یہ تین اسباب آسانی سے ہو سکتے تھے :- یا یہ کہ برنی کا وطن جس علاقے کا مرکز تھا، وہاں کی بغاوت فرو کرنے میں ممکن ہے کہ خود برنی کو ذاتی طور پر کوئی نقصان پہنچا ہو۔یا یہ کہ آپنی ترفع و ترقی کی کوششوں میں ناکامی رہی ہو۔یا یہ کہ سلطان کا روزافزوں انحطاط دیکھ کر اس کے قلب کو سخت صدمہ ہوا ہو۔مگر یہ تینوں احتمال اس لیے باطل ہیں کہ اول الذکر کا خفیف سا بھی ثبوت نہیں۔دوسرے سبب کے متعلق صرف ایک اشارہ ملتا ہے مگر اس سے سلطان ہی کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔تیسرے احتمال کی تردید خود برنی کا ہلکا لہجہ کر رہا ہے۔

اس کا اصلی سبب ایک اور گہرے مسئلے میں پوشیدہ ہے، جس پر عموماً مؤرخین کی نظر نہ ہونے سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا بہت کچھ حصہ ناقابلِ فہم ہوگیا ہے۔التمش سے